اصولِ تعلیم

حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کے واقعہ کی روشنی میں

ڈاکٹر شمس العارفین*

ڈاکٹر عبد القدوس**

ABSTRACT

The prime aim of this paper is to explore the principle and lessons of knowledge acquisition from the event of Prophet Moses and Khizar (AS) narrated in the Holy Quran. Almighty Allah (SWT) has provided detailed account of interaction between Prophet Moses and Khizar (AS) including the time they spent together, various wonders Prophet Moses came across and his final departure from Khizar.One can derive many lessons on learning process and knowledge acquisition from this event. In addition to the education process, this study has revealed important aspects of student teacher relationship and the importance of their roles. Moreover, the paper highlights the influences and prerogatives of the teachers in light of the mentioned event. It does not only cover the respect of the teacher by the students but also the teachers' thinking about the welfare of the students and their impact on the advantages of the education process. Therefore, the analysis of the event results in many social and educational implications regarding students' behavior and attitude towards learning as

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، سرگودھا یونیورسٹی، لاہور کیمپس

** اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز اینڈ ریسرچ، یو ایس ٹی بنوں

well as their teachers. The paper also encompasses the rules related to the education process in particular the special consideration at students' part for better learning.

Keywords: اصول تعلیم، علم، خضر و موسیٰ، تحصیل، استاد، طالب علم، قرآن

قرآن کریم کتاب ہدایت ہے اور یہ انتہائی جامع انداز میں - انسانیت کی راہنمائی کے لئے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، خواہ ان کا تعلق احکام و عقائد سے ہو، وعدہ وعید سے ہو یا امثال و قصص سے ہو۔ نفسِ انسانی کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ دوسروں کے واقعات سے جلدی عبرت حاصل کرتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مختلف انبیاء و اقوام کے واقعات جابجا بیان فرمائے ہیں۔ ان واقعات میں سے ایک واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا بھی ہے، جس میں کئی نصائح و عبر موجود ہیں۔

حضرت موسی علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے صاحبِ کتاب جلیل القدر پیغمبر ہیں جبکہ حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت میں اختلاف ہے۔[1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ بنی اسرائیل کے سامنے بڑے بلیغ انداز میں خطاب فرمایا۔ لوگوں نے پوچھا آپ سے بڑا بھی کوئی عالم ہے؟ حضرت موسی علیہ السلام نے فرمایا: نہیں، تو اللہ تعالیٰ نے تنبیہاً حضرت خضر علیہ السلام کے پاس جانے اور ان سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا،[2] چنانچہ آپ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے پاس چلے گئے، اُن کے ساتھ وقت گزارا، کئی عجائبات دیکھے اور اللہ تعالیٰ نے سمجھا دیا کہ علم کی کوئی انتہا نہیں۔ حقیقت میں علمِ کُلی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور بندوں کو علم کا بہت تھوڑا حصہ دیا گیا ہے۔ متعلقہ آیات ﴿وَإِذْ قَالَ مُوسٰى لِفَتَاهُ ۔۔۔۔مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا﴾[3] کا مولانا احمد علی لاہوریؒ کا بامحاورہ ترجمہ ذکر کیا جاتا ہے تاکہ واقعۂ مذکورہ اجمالی طور پر ذہن میں رہے:

"اور جب موسیٰ نے اپنے جوان سے کہا کہ میں نہ ہٹوں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر

1 -الآلوسی، شهاب الدین ابو الفضل، (م1270ھ)، روح المعانی ،داراحیاء التراث العربی بیروت، بذیل الکهف 65:18

2-البخاری، محمد بن اسماعیل (م 256ھ)، الجامع الصحیح، محقق:محمد زهیر بن ناصر الناصر، دار طرق النجاة ،1422ھ رقم الحدیث 122

3-الکہف18: 60 تا 78

پہنچ جاؤں یا سالہا سال چلتا جاؤں۔ پھر جب وہ دو دریاؤں کے جمع ہونے کی جگہ پر پہنچے دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے پھر مچھلی نے دریا میں سرنگ کی طرح کا راستہ بنالیا۔ پھر جب وہ دونوں آگے بڑھ گئے تو اپنے جوان سے کہا کہ ہمارا ناشتہ لے آ، البتہ تحقیق ہم نے اس سفر میں تکلیف اٹھائی ہے۔ کہا کیا تونے دیکھا جب ہم اس پتھر کے پاس ٹھہرے تو میں مچھلی کو وہیں بھول آیا، اور مجھے شیطان ہی نے بھلایا ہے کہ اس کا ذکر کروں، اور اس نے اپنی راہ سمندر میں عجیب طرح سے بنالی۔ کہا یہی ہے جو ہم چاہتے تھے، پھر اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہی الٹے پھرے۔ پھر ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ کو پایا جسے ہم نے اپنے ہاں سے رحمت دی تھی اور اسے ہم نے اپنے پاس سے ایک علم سکھایا تھا۔ اسے موسیٰ نے کہا کیا میں تیرے ساتھ رہوں اس شرط پر کہ تو مجھے سکھائے اس میں سے جو تجھے ہدایت کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔ کہا بے شک تو میرے ساتھ ہر گز صبر نہیں کر سکے گا۔ اور تو صبر کیسے کرے گا اس بات پر جو تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ کہا ان شاء اللہ تو مجھے صابر ہی پائے گا اور میں کسی بات میں بھی تیری مخالفت نہیں کروں گا۔ کہا پس اگر تو میرے ساتھ رہے تو مجھ سے کسی بات کا سوال نہ کر یہاں تک کہ میں خود تیرے سامنے اس کا ذکر کروں۔ پس دونوں چلے، یہاں تک کہ جب کشتی میں سوار ہوئے تو (بندے نے) اسے پھاڑ دیا، (موسیٰ نے) کہا کیا تو نے اس لیے پھاڑا ہے کہ کشتی کے لوگوں کو غرق کر دے، البتہ تو نے خطرناک بات کی ہے۔ کہا کیا میں نے تجھے نہیں کہا تھا کہ تو میرے ساتھ صبر نہیں کر سکے گا۔ کہا میرے بھول جانے پر گرفت نہ کر اور میرے معاملہ میں سختی نہ کر۔ پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ انہیں ایک لڑکا ملا تو (بندے نے) اسے مار ڈالا، (موسیٰ نے) کہا تو نے ایک بے گناہ کو ناحق مار ڈالا، البتہ تو نے بری بات کی۔ کہا کیا میں نے تجھے نہیں کہا تھا کہ تو میرے ساتھ صبر نہیں کر سکے گا۔ کہا اگر اس کے بعد میں آپ سے کسی چیز کا سوال کروں تو مجھے ساتھ نہ رکھیں، آپ میری طرف سے معذوری تک پہنچ جائیں گے۔ پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ جب ایک گاؤں والوں پر گزرے تو ان سے کھانا مانگا انہوں نے مہمان نوازی سے انکار کر دیا پھر انہوں نے وہاں ایک دیوار پائی جو گرنے ہی والی تھی تب اسے سیدھا کر دیا، کہا اگر آپ چاہتے تو اس کام پر کوئی اجرت ہی لے لیتے۔ کہا اب میرے اور تیرے درمیان جدائی ہے، اب میں تجھے ان باتوں کا راز بتاتا ہوں جن پر تو صبر نہ کر سکا۔"[1]

1- لاہوری، احمد علی، مولانا (م 1362ھ)، قرآن حکیم، تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور، پاکستان، اکتوبر ۲۰۰۱ء، بذیل الکھف 18: 60 تا 78

چنانچہ خضر علیہ السلام نے ان تینوں کاموں کی حکمت بتادی اور وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

مذکورہ واقعہ میں کافی تفصیل ہے اور اس سے بہت سے نصائح و عبرتیں حاصل کی جاسکتی ہیں لیکن زیرِ نظر مضمون میں واقعہ مذکورہ کی روشنی میں آداب المعلمین والمتعلمین تحریر کیے جاتے ہیں کہ معلمین کے پاس کیا کیا اختیارات ہیں اور متعلمین کی بہتری کے لیے وہ کیا کیا طریقے اختیار کر سکتے ہیں؟ اسی طرح متعلمین کو اساتذہ کا کتنا خیال رکھنا چاہیے، اُن کا کیا درجہ ہے اور علم حاصل کرتے ہوئے کیا کیا برداشت کرنا چاہیے؟ علاوہ ازیں واقعہ مذکورہ سے ایک علمی ادارے کے قوانین اور اصول وضوابط بھی اخذ کیے جائیں گے، انشاءاللہ تعالیٰ۔

طلبِ علم کے لیے گھر سے نکلنا

حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کی تلاش میں نکلے اور پکا ارادہ کیا کہ جب تک مَیں اُن سے نہ ملوں مَیں چلتا ہی رہوں گا، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّى أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا﴾[1]

''''اور جب موسیٰ نے اپنے جوان سے کہا کہ میں نہ ہٹوں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر پہنچ جاؤں یا سالہا سال چلتا جاؤں۔''

لہٰذا کسی بھی طالب علم کے لیے گھر چھوڑنا اولین شرط ہے۔ حصول علم کی ناگزیر ضرورت ہوتی ہے۔ آج کل بعض دنیادار لوگ جو اپنے بچوں کی ٹیوشن کے لیے یہاں تک کہ قرآن پڑھانے کے لیے بھی استاد کو اپنے گھر بلاتے ہیں۔ اس میں علم کی بے ادبی ہے اور اس طرح حاصل کیا گیا علم بے برکت ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ کتب تاریخ میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید جب حج کے لیے گیا تو مدینہ منورہ میں اس نے چاہا کہ امام مالک رحمہ اللہ اس کے صاحبزادوں امین اور مامون کو اس کے محل میں آکر انہیں حدیث پڑھائیں۔ آپ نے معذرت کرلی اور کہا کہ مسجد نبوی میں میرا درس حدیث مفتوح ہوتا ہے اور جو چاہے اس میں بلا روک ٹوک آسکتا ہے۔ آپ بھی اپنے صاحبزادوں کو بھجوادیجیے۔ چنانچہ ہارون نے انہیں آپ کے درس میں بھجوایا لیکن وہ تاخیر سے پہنچے اور انہیں لوگوں کے جوتوں میں جگہ ملی لیکن امام مالک علیہ الرحمہ وقار سے اپنی جگہ درس دیتے رہے اور پروا نہیں کی کہ کون آتا اور کون جاتا ہے۔ چنانچہ شہزادوں نے درس سنا اور ختم ہونے پر اٹھ کر واپس آگئے۔[2]

1- الکھف 60:18

2- اصلاحی، ضیاء الدین، تذکرہ المحدثین، دارالبلاغ لاہور، اشاعت 2014ء، 66:1

علمی لحاظ سے کم درجہ والے کو استاد بنانا

یہ ضروری نہیں کہ استاد شاگرد سے ہر لحاظ سے علم میں آگے ہو بلکہ جس مضمون یا فن میں شاگرد سیکھنا چاہتا ہے، اس میں استاد کا علم زیادہ ہونا چاہیے، اگرچہ مجموعی طور پر شاگرد استاد سے اعلم کیوں نہ ہو، مثلاً اگر ایک بڑا عالم کسی درزی کے پاس چلا جائے اور اس سے کپڑے سینا سیکھنا شروع کرے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ درزی عالم سے ہر لحاظ سے اعلم ہے۔ اسی طرح واقعہ مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر رسول تھے اور حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت بھی مشکوک ہے اور ظاہر ہے کہ رسول کا علم نبی سے زیادہ ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کی شاگردی اختیار کی۔ لہٰذا کسی بھی شاگرد کو چاہیے کہ وہ علم سیکھنے میں عار محسوس نہ کرے اور یہ نہ دیکھے کہ میرا استاد تو فلاں فن میں میرے جیسا ماہر نہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جس علم یا فن کے سیکھنے کے لیے شاگرد استاد کے پاس جاتا ہے اُس میں استاد شاگرد سے اعلم ہو۔ یہی حال آج کل یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے فرض کیجیے پی ایچ ڈی کا ایک طالب علم اصول فقہ کے کسی ایک علمی نکتے پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنا چاہتا ہے اور اس مقالہ کے لیے نگران و مشرف پروفیسر صاحب علوم اسلامیہ کے سینئر استاد ہیں لیکن ان کا تخصص اصول فقہ میں نہیں ہے تو ممکن ہے اصول فقہ کے متعلقہ قضیہ میں طالب علم کا استاد سے زیادہ ہوا۔ اور اسی طرح کی صورت حال بعض اوقات تدریس میں بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شاگرد استاد کی عزت نہ کرے یا اس کے علم و تجربے سے استفادہ کرنے میں اپنی ہتک محسوس کرے۔

اجازتِ تعلیم

حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام جب حضرت خضر عَلَیْہِ السَّلَام کے پاس گئے اور اُن سے ملاقات ہو گئی تو سب سے پہلے پوچھا:

﴿هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾[1]

"کیا میں تیرے ساتھ رہوں اس شرط پر کہ تو مجھے سکھائے اس میں سے جو تجھے ہدایت کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔"

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے اجازت حاصل کرنے کے لیے درخواست پیش کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی بھی طالب علم کے لیے سب سے پہلے اپنے استاد سے اجازت لینا انتہائی ضروری ہے۔ کسی بھی طالب علم کا یہ حق نہیں کہ وہ استاد کی اجازت کے بغیر اس سے کچھ سیکھے یا اس کے پاس رہے۔ اسی طرح کسی بھی

1- الکھف 60:18

تعلیمی ادارے میں سربراہِ ادارہ کی اجازت کے بغیر سبق پڑھنا یا کلاس میں بیٹھنا ممنوع ہے۔ آج کل بعض تعلیمی اداروں کا یہ ایک بڑا مسئلہ ہے کہ بعض بچے داخلہ لیے بغیر ادارہ میں آکر تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بعض اوقات یہی پرائیویٹ بچے ادارہ کے تعلیمی ماحول کو خراب کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں کیونکہ وہ اصول وضوابط کا احترام نہیں کرتے اور نہ ہی خود کو ان کا پابند تصور کرتے ہیں۔

خدمت کو طلبِ علم پر مقدم کرنا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "کیا میں آپ کی اتباع کر سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے علم سکھا دیں؟" یعنی پہلے اتباع اور بعد میں طلبِ علم۔ اس میں اشارہ ہے کہ شاگرد کو چاہیے کہ وہ خود کو سو فیصد استاد کے حوالے کرے اور استاد کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھے۔ اسی طرح استاد طیبِ نفس اور فراخ دلی سے اُسے علم منتقل کرنے کی کوشش کرے۔

اظہار عاجزی

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو علم دیا ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھا دیں۔ اس جملہ میں کئی پہلوؤں سے عاجزی ظاہر ہوتی ہے مثلاً استاد کے علم کا اقرار اور اپنی بے علمی کا اظہار۔ اس کے علاوہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ مجھے وہ سب کچھ سکھا دیں جو آپ کو ملا ہے بلکہ کہا کہ آپ اپنے علم کا کچھ حصہ مجھے بھی عطا فرمائیں۔ اس میں انتہائی عاجزی ہے کہ استاد کے ساتھ علم میں برابری کا مطالبہ نہیں بلکہ ایک حصہ کا طلب گار ہے۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں اس کی تصریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

وَثَالِثُهَا: أَنَّهُ قَالَ عَلَى أَنْ تُعَلِّمَنِ وَهَذَا إِقْرَارٌ لَهُ عَلَى نَفْسِهِ بِالْجَهْلِ وَعَلَى أستاذه بالعلم. ورابعها: أنه قال:مِمَّا عُلِّمْتَ وَصِيغَةُ مِنْ لِلتَّبْعِيضِ فَطَلَبَ مِنْهُ تَعْلِيمَ بَعْضِ مَا عَلَّمَهُ اللهُ، وَهَذَا أَيْضًا مُشْعِرٌ بِالتَّوَاضُعِ كَأَنَّهُ يَقُولُ لَهُ لَا أَطْلُبُ مِنْكَ أَنْ تَجْعَلَنِي مُسَاوِيًا فِي الْعِلْمِ لَكَ، بَلْ أَطْلُبُ مِنْكَ أَنْ تُعْطِيَنِي جُزْءًا مِنْ أَجْزَاءِ عِلْمِك.[1]

1- الرازی، محمد بن عمربن الحسن بن الحسین، فخرالدین،الامام،(م606ھ)، مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) ،دار احیاء التراث العربی ،بیروت ، 1420ھ، بذیل الکھف 18 :66

"تیسری یہ کہ موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام نے کہا کہ آپ مجھے علم سکھا دیں۔ اس میں اقرار ہے اپنے جہل کا اور استاد کے علم کا۔ چوتھی یہ کہ مِن تبعیضیہ استعمال کیا ہے جس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو علم دیا ہے مجھے اس میں سے کچھ سکھا دیں یعنی یہ کہ علم میں آپ کے ساتھ برابری کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ آپ کے علم کا ایک حصہ چاہتا ہوں جو کہ عاجزی کی انتہا ہے۔"

لہٰذا کسی بھی طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود کو جاہل اور استاد کو اعلم تصور کرے، یوں وہ اپنے اندر عاجزی کی صفت پیدا کرے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اُس کو بلندی عطا فرمائے گا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

"مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَهُ اللّٰهُ"[1]

"جس نے اللہ کے لئے عاجزی اختیار کی اللہ تعالیٰ اس کو بلند فرمائے گا۔"

اُستاد کا حکم ماننا

مذکورہ آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں بلکہ یوں عرض کیا کہ کیا میں آپ کی اتباع کر سکتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شاگرد کو استاد کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے۔ استاد اور شاگرد کا صرف ایک جگہ رہنا نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک تربیتی عمل ہوتا ہے اور اس سے فائدہ اسی صورت میں زیادہ ہوتا ہے جب شاگرد اپنے آپ کو استاد کے حوالہ کر دے کہ وہ جو کچھ بنانا چاہے بنا سکے۔ اگر شاگرد اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارے تو شاید اسے گوہرِ مقصود حاصل نہ ہو سکے۔ آج کل یہ بھی ایک بڑا مسئلہ ہے کہ شاگرد استاد پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتا ہے، خصوصاً طلبہ یونین یا سٹوڈنٹ فیڈریشن کی صورت میں اجتماعی طور پر طلبہ وہ اپنے حقوق کے نام پر جو مطالبات کرتے ہیں اُن میں اکثر و بیشتر کا تعلق توہینِ استاد یا توہین سربراہِ ادارہ کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

مقصدِ حقیقی حصولِ علم ہو

مذکورہ واقعہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں اس غرض سے آپ کے پاس رہنا چاہتا ہوں کہ آپ مجھے وہ علم سکھائیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو طالب علم کسی استاد کے پاس جاتا ہے تو اس کا حقیقی مقصد حصولِ علم ہونا چاہیے نہ کہ کچھ اور۔ اسی طرح کسی دنیاوی فن کے ماہر کے پاس اگر کوئی

---

1 - البیهقی ، احمد بن الحسین بن علی، ابوبکر، شعب الایمان ،مکتبة الرشد ،ریاض ، 1423ھ، رقم الحدیث:7790

رہے تو جس فن کے سیکھنے کا اس نے ارادہ کیا ہے وہی مقصدِ حقیقی ہو۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور مقصد غالب آجائے تو مطلوبہ علم یا فن کے حصول میں رکاوٹ آئے گی۔ جس طرح کہ آج کل تعلیمی ماحول ہے کہ طلبہ کے پیشِ نظر ڈگری کا حصول اور اس کی بنیاد پر ملازمت کا حصول ہوتا ہے۔ پڑھنے لکھنے اور علم حاصل کرنے میں انہیں زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔

شاگرد کا وقت ضائع نہ کرنا

مذکورہ آیات کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے عرض کیا کہ میں اس شرط پر آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں کہ آپ مجھے وہ علم سکھائیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شاگرد کا استاد کے پاس رہنے کا حقیقی مقصد حصولِ علم ہے لہٰذا استاد شاگرد کی علمی ترقی کا خیال رکھے اور صرف اپنی خدمت یا کوئی اور دنیوی غرض سامنے نہ رکھے۔ آج کل اس اصول پر بھی عمل نہیں ہو رہا بلکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض سکول اساتذہ سکول ٹائم میں تدریس پر توجہ نہیں دیتے بلکہ طلبہ کو ترغیب دیتے ہیں کہ شام کو ان کے پاس اکیڈمی میں ٹیوشن پڑھنے جائیں۔ اس سے نہ صرف طلبہ کے وقت کا ضیاع ہوتا ہے بلکہ اسے مزید مالی بوجھ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح یونیورسٹیوں میں بھی بعض اساتذہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ کو وقت اور توجہ نہیں دیتے۔ ان کے کام میں تاخیر ہوتی رہتی ہے اور بعض اوقات انہیں دوبارہ فیس دینا پڑتی ہے اور وقت میں توسیع کے لیے درخواستیں دینا پڑتی ہیں۔

طالب علم کی ذہن سازی

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسی علیہ السلام کو اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دینے سے پہلے اُنہیں بتادیا کہ میرے ساتھ رہنے میں آپ کو دشواریاں پیش آئیں گی۔ مَیں جو کام کروں گا وہ آپ کی سمجھ میں نہ آئیں گے اور آپ صبر نہ کرسکیں گے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَى مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا﴾[1]

"کہا بے شک تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کرسکے گا، اور تو صبر کیسے کرے گا اس بات پر جو تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

لہٰذا اُستاد کو چاہیے کہ وہ پہلے سے شاگرد کی ذہن سازی کرے اور اُسے علم کے راستے میں آنے والی رکاوٹوں

1- الکھف18: 67 تا 68

اور تکالیف سے آگاہ کرے تاکہ اُس کے اندر مستقل مزاجی کی صفت پیدا ہو سکے۔ علامہ ابن عاشورؒ نے یہی حقیقت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

"وَفِي هَذَا أَصْلٌ مِنْ أُصُولِ التَّعْلِيمِ أَنْ يُنَبِّهَ الْمُعَلِّمُ الْمُتَعَلِّمَ بِعَوَارِضِ مَوْضُوعَاتِ الْعُلُوم الملقنة لَاسِيَمَا إِذَا كَانَتْ فِي مُعَالَجَتِهَا مَشَقَّةٌ."[1]

"اس میں اصول تعلیم کا ایک بنیادی قانون ہے اور وہ یہ کہ استاد شاگرد کو تعلیم کے راستے میں آنے والے تمام عوارض و مشکلات سے آگاہ کرے خصوصاً اگر اس کے حصول میں مشقت بھی زیادہ ہو۔"

اسی مقصد کی خاطر آج کل داخلہ دینے سے پہلے انٹرویو کیا جاتا ہے جس میں طالب علم کی جستجو اور صلاحیت کا معائنہ کر کے داخلہ دینے یا نہ دینے کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے۔

استاد کا شاگرد کے سامنے اپنا علمی مرتبہ بیان کرنا

استاد کو چاہیے کہ پہلے دن طلبہ کے سامنے اپنا تعارف کرائے، اُنہیں اپنے علمی مقام اور ڈگریوں سے مطلع کر کے ان پر ایک قسم کا رعب ڈالنے کی کوشش کرے تاکہ ذہنی طور پر وہ استاد کی عزت و احترام کے لیے تیار ہو جائیں اور علمی تکبر و غرور سے محفوظ رہیں۔ جیسا کہ واقعہ مذکورہ میں حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میرے پاس ایسا علم ہے جو تیرے علمی احاطہ میں نہیں آسکتا تو تم میرے ساتھ کیسے گزارہ کرو گے؟ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں اس نکتہ کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

"وَأَمَّا الْمُعَلِّمُ فَإِنْ رَأَى أَنَّ فِي التَّغْلِيظِ عَلَى الْمُتَعَلِّمِ مَا يُفِيدُهُ نَفْعًا وَإِرْشَادًا إِلَى الْخَيْرِ. فَالْوَاجِبُ عَلَيْهِ ذِكْرُهُ فَإِنَّ السُّكُوتَ عَنْهُ يُوقِعُ الْمُتَعَلِّمَ فِي الْغُرُورِ وَالنَّخْوَةِ وَذَلِكَ يَمْنَعُهُ مِنَ التَّعَلُّمِ."[2]

"اگر استاد مناسب سمجھے کہ شاگرد کے ساتھ سختی سے پیش آنے میں اس کا نفع ہے اور یوں وہ بھلائی کی طرف آسکتا ہے تو استاد کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے کیونکہ اگر استاد ایسا نہ کرے تو اس سے

1-ابن عاشور ، محمد طاهر، التحرير و التنوير، بذيل الكهف 18 :67 تا 68

2-مفاتيح الغيب (التفسير الكبير)،بذيل الكهف 18 :68

شاگرد تکبر وغرور میں مبتلا ہو جاتا ہے جو تحصیلِ علم کے لئے رکاوٹ ہے۔"

لہٰذا استاد کو چاہیے کہ وہ طلبہ کے ساتھ ایک مناسب فاصلہ بر قرار رکھے۔ اپنا علمی وقار اُن کے سینوں میں جمائے رکھے تاکہ استاد کا رعب اور عظمتِ شان اُن پر واضح ہو اور وہ استاد کو ایک عام دوست کی طرح نہیں بلکہ ایک مربی کی طرح سمجھیں اور ایک قسم کا خوف اُن کے دلوں میں موجزن ہو۔

شرائط وضوابط

حضرت خضر علیہ السلام نے جب محسوس کیا کہ حضرت موسی علیہ السلام ہر حال میں میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو اپنی طرف سے یہ شرط لگائی کہ جب تک مَیں کسی بات کی تفصیل نہ بتادوں آپ کسی بھی معاملہ میں پہل کر کے مجھ سے نہ پوچھیں گے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّى أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا﴾[1]

"کہا پس اگر تو میرے ساتھ رہے تو مجھ سے کسی بات کا سوال نہ کر یہاں تک کہ میں خود تیرے سامنے اس کا ذکر کروں۔"

لہٰذا کسی بھی استاد یا ادارہ کو پہلے سے باقاعدہ واضح طور پر اپنے شرائط وضوابط کا پیش کرنا ضروری ہے، تاکہ داخلہ لینے والا ان سے بخوبی آگاہ ہو، اگر وہ شرائط وضوابط کی پابندی کر سکتا ہو تو داخلہ لے گا ورنہ چھوڑ دے گا۔

بے موقع سوال نہ کرنا

مذکورہ آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر پابندی لگائی کہ جب تک مَیں بولنے کی اجازت نہ دوں آپ سوال نہ کریں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کسی بھی طالب علم کے لیے سوال کے آداب سے واقف ہونا انتہائی ضروری ہے، اُسے چاہیے کہ اُستاد کا مزاج معلوم کرے اگر استاد لیکچر کے درمیان سوال کرنا پسند نہ کرتا ہو تو اُسے چاہیے کہ اثنائے لیکچر سوال نہ کرے بلکہ ذہن میں اگر کوئی سوال آئے تو اپنے پاس نوٹ کرلے اور آخر میں پوچھ لیں۔ البتہ اگر استاد کی طرف سے ہر وقت پوچھنے کی اجازت ہو تو درمیانِ لیکچر بھی سوال کر سکتا ہے۔

استاد پر اعتراض کرنے کا حق

مذکورہ واقعہ میں جب حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو نقصان پہنچایا، بلاوجہ خوبصورت بچہ کو قتل کیا اور بلا معاوضہ

1-الکھف 18 : 70

ایک ایسی قوم کی دیوار کو درست کیا جنہوں نے اُنہیں کھانا کھلانے سے انکار کیا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہر دفعہ اپنے استاد پر اعتراض کیا اور خاموش نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر استاد کوئی ایسی بات کہے یا ایسا کام کرے جو شاگرد کے ذہن میں نہ آئے تو اسے ادب کالحاظ رکھتے ہوئے اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس کی کئی مثالیں ہمارے اسلاف میں بھی موجود ہیں، یہاں امام بخاریؒ کا ایک واقعہ مثالاً ذکر کیا جاتا ہے:

"فجعلت أختلف إِلَى الداخلي، وغيره، وَقَال يوما فيما كَانَ يقرأ للناس: سُفْيَان عَن أَبِي الزبير عَنْ إِبْرَاهِيم، فقلت له: يَا أَبَا فلان إن أَبَا الزبير لم يرو عَنْ إِبْرَاهِيم فانتهرني. فقلت له: ارجع إِلَى الأصل إن كَانَ عندك، فدخل ونظر فيه ثُمَّ خرج. فَقَالَ لي: كيف هُوَ يَا غلام؟ فقلت: هُوَ الزبير بْن عدي عَنْ إِبْرَاهِيم، فأخذ القلم مني وأصلح كتابه، وَقَال: صدقت."[1]

"(امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ) میں امام داخلی کے پاس آنا جانا تھا اور ایک دن وہ لوگوں کو پڑھا رہے تھے کہ "سفیان نے ابو زبیر سے اور انہوں نے ابراہیم سے نقل کیا ہے" تو میں نے انہیں کہا حضرت! ابو زبیر نے ابراہیم سے کبھی روایت نقل نہیں کی ہے۔ انہوں نے مجھے جھڑکا۔ میں نے کہا اپنی اصل (کتاب) کی طرف رجوع کریں اگر وہ آپ کے پاس ہے، چنانچہ وہ اندر چلے گئے اُس میں دیکھا اور نکل کر مجھے کہا اے بچے وہ کیسا ہے؟ تو میں نے کہا کہ زبیر بن عدی ہے جو ابراہیم سے نقل کرتا ہے۔ انہوں نے مجھ سے قلم لیا اور اپنا نسخہ درست کر کے کہنے لگے: تونے سچ کہا۔"

خلاصہ یہ ہوا کہ اگر شاگرد استاد کی کسی بات کو نہ سمجھے تو خاموش نہیں رہنا چاہیے بلکہ اشکال رفع کرنے کے لیے استاد سے پوچھے۔ اگر شاگرد نہ سمجھے اور خاموش رہے تو یہ اپنے ساتھ خیانت ہے۔ حصولِ تعلیم میں اس قدر زیادہ شرم قابلِ مدح نہیں جو سوال کے لیے بھی مانع ہو جائے۔ جیسا کہ امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے:

قَالَ مُجَاهِدٌ: «لاَ يَتَعَلَّمُ العِلْمَ مُسْتَحْيٍ وَلاَ مُسْتَكْبِرٌ» وَقَالَتْ عَائِشَةُ: «نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الأَنْصَارِ لَمْ يَمْنَعْهُنَّ الحَيَاءُ أَنْ يَتَفَقَّهْنَ فِي الدِّينِ»[2]

1-الخطيب البغدادى، تاريخ بغداد و ذيوله ، ، دارالكتب علمية بيروت، 1417ھ، 2:7

2-البخارى، الجامع الصحيح، كتاب العلم، بَابُ الحَيَاءِ فِي العِلْمِ،1:38

”مجاہد نے فرمایا کہ زیادہ حیاء کرنے والا اور تکبر کرنے والا علم حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا فرماتی ہیں انصار کی عورتیں بہت اچھی ہیں حیاء نے ان کو دین سمجھنے سے منع نہیں کیا۔“

البتہ یہ ضروری ہے کہ سوال کرتے ہوئے ادب کا دامن تھامے رکھنا چاہیے۔ اچھے طریقے سے سوال کرنے کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"الِاقْتِصَادُ فِي النَّفَقَةِ نِصْفُ الْمَعِيشَةِ، وَالتَّوَدُّدُ إِلَى النَّاسِ نِصْفُ الْعَقْلِ، وَحُسْنُ السُّؤَالِ نِصْفُ الْعِلْمِ."[1]

”خرچہ میں میانہ روی نصف معیشت ہے، لوگوں سے محبت کرنا نصف عقل ہے اور اچھے طریقے سے سوال کرنا نصف علم ہے"

طالب علم کے اندر جستجو کی صفت پیدا کرنا

مذکورہ واقعہ میں حضرت خضر علیہ السلام نے کئی ایسے کام کیے جو فی الوقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ سمجھ سکے اور مزید یہ کہ حضرت خضر علیہ السلام نے فوراً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی حکمت بھی نہ بتائی۔ اس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ استاد کو کبھی کبھار شاگرد کو ایسا موقع دینا چاہیے کہ وہ شاگرد کے سامنے نیا لفظ یا سوال پیش کرے یا کوئی ایسی اصطلاح استعمال کرے جو شاگرد کو سوچنے پر مجبور کرے اور پھر فوراً اُس کا مطلب نہ بتائے بلکہ سوچنے کا موقع دے یا گھر کے کام کے طور پر چھوڑ دے پھر دوسرے دن اُس کے بارے میں پوچھے۔ اس طرح طالب علم کے اندر سوچنے، فیصلہ کرنے اور تخلیقی کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے جو کہ تحقیق کی بنیاد ہے۔

شاگرد کو تنبیہ اور تدریجی سزا

مذکورہ واقعہ میں جب پہلی مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شرائط و ضوابط سے ہٹ کر حضرت خضر علیہ السلام پر اعتراض کیا تو اُنہوں نے نرمی سے سمجھایا کہ مَیں نے تو کہا تھا کہ آپ صبر نہ کر سکیں گے۔ دوسری دفعہ بولنے پر تھوڑی تنبیہ کر کے سختی سے فرمایا کہ مَیں نے تو آپ سے کہا تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہیں ہو سکے گا، لیکن تیسری دفعہ بولنے پر صاف کہہ دیا کہ مزید میرا تیرا ایک جگہ اکٹھا رہنا نہیں ہو سکتا، آپ مجھ سے جدا ہو جایئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ طالب علم اگر شرائط و ضوابط کے خلاف کوئی قدم اُٹھائے تو اُسے نرمی سے سمجھا دیا جائے کہ

1- شعب الایمان ، رقم الحدیث: 6148

ایسا نہ کرو، یہ ہمارے اُصولوں کے خلاف ہے۔ اگر وہ نہ مانا اور دوسری مرتبہ بھی غلطی کی تو تھوڑی سختی سے اُسے سمجھا دینا چاہیے اور وارننگ دینی چاہیے کہ اگر سہ بارہ ایسا کیا تو سخت سزا دی جائے گی۔ اگر وہ پھر بھی نہ سمجھے اور تیسری مرتبہ بھی اس نے وہی غلطی کر ڈالی تو اُسے سزا دینی چاہیے حتیٰ کہ اگر سزا دینے سے اُس کی اصلاح کا غالب گمان نہ ہو تو اسے ادارہ سے خارج کر دینا چاہیے تا کہ اور بچوں یا ادارہ کے ماحول کی خرابی کا سبب نہ بنے۔

عصر حاضر میں مغربی تہذیب کے زیر اثر ہمارے تعلیمی حلقوں میں یہ رواج پڑ گیا ہے کہ استاد کو کوئی حق نہیں کہ وہ طالب علم کو ڈانٹے ڈپٹے یا تھوڑی بہت سزا دے۔ حکومتی محکمے اس چیز کو ٹی وی اخبارات وغیرہ میں اتنا اچھالتے ہیں اور ہر سکول کے گیٹ پر استاد کی شکایت کرنے کے لیے فون نمبر لکھے ہوتے ہیں کہ اگر استاد طلبہ پر سختی کرے تو وہ استاد کے خلاف تادیبی کاروائی کرنے کے لیے محکمہ کے افسران کو فون کرے۔ یہ ایک انتہا ہے جس میں اساتذہ کی سبکی ہے اور اس طرح کے ماحول میں طلبہ غیر مؤدب ہو جاتے ہیں اور استاد کی عزت نہیں کرتے اور جس تعلیمی ادارے کا یہ ماحول ہو کہ طلبہ استاد کی عزت اور ادب نہ کریں وہاں وہ کیا سیکھیں گے اور استاد انہیں کیا سکھائے گا۔

اس کے برعکس ایک دوسری انتہا ہے جس میں والدین جا کر استاد سے کہتے ہیں کہ جتنا چاہو ہمارے بیٹے کو مارو پیٹو، بس پڑھا دو۔ مذہبی تعلیم میں اور خصوصاً حفظ قرآن کی کلاس میں بعض اساتذہ طلبہ کو مارنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور اس کے لیے شرعی دلیلیں دیتے ہیں۔ اور بعض مدارس میں خصوصا جنوبی پنجاب کے دینی مدارس میں طلبہ کو زنجیروں میں جکڑ کر مارنے کی خبریں اخبارات اور ٹی وی کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ تدریس کا غلط طریقہ ہے۔

صحیح طرز عمل اس ضمن میں یہ ہے کہ افراط و تفریط سے بچا جائے، نہ تو طلبہ پر بلاوجہ تشدد کیا جائے اور نہ یہ کہ استاد کو بچوں کو ڈانٹنے کی اجازت ہی نہ ہو بلکہ جیسا کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"خير الأمور أوسطها"[1]

"بہترین کام وہ ہیں جن میں میانہ روی اختیار کی جائے۔

لہذا ضروری ہے کہ طلبہ کو پیار و محبت سے پڑھایا جائے لیکن بوقت ضرورت استاد کو تنبیہ اور تأدیب کرنے کی بھی اجازت ہونی چاہیے۔

---

[1]- الجزري، ابن اثیر، مجد الدین ابو السعادات، جامع الاصول فی احادیث الرسول، مکتبہ دار البیان، بیروت، 1972، 130:10

امتثالِ امر

واقعہ مذکورہ میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کی شرائط پر پورا نہ اترے تو بالآخر حضرت خضر علیہ السلام نے اُن کو اپنے سے جدا کرنے کا حکم دے دیا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بطیبِ خاطر قبول کیا۔ لہٰذا کسی بھی شاگرد کے لئے یہ ضروری ہے کہ استاد یا ادارہ کی طرف سے جو بھی تادیبی کارروائی (جرمانہ، سزا، یا ادارے سے اخراج وغیرہ کی صورت میں) کی جائے اُسے بخوشی قبول کرے اور کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہ کرے۔ آج کل خودغرضی اور مطلب پرستی کا یہ ایک بڑا مسئلہ ہے کہ جب تک بچہ کسی ادارہ میں پڑھتا رہتا ہے تو استاد بھی اچھا، ادارہ بھی اچھا، لیکن بامر مجبوری اگر ادارہ اُس کے لئے کوئی سزا تجویز کرے تو وہ کسی کو بھی معاف نہیں کرتا اور استاد یا منتظم یا ادارے کے خلاف ناروا اور منفی پروپیگنڈہ کرنے لگتا ہے ایسا نہیں کرنا چاہیے، اگر کسی طالب علم کی وجہ سے ادارہ کو نقصان ہو رہا ہو تو ادارہ اور خود اس طالب علم کی خیر خواہی میں انتظامیہ اگر یہ فیصلہ کرے کہ یہ طالب آئندہ یہاں نہ پڑھے تو اُسے بخوشی قبول کرنا چاہیے۔ اساتذہ اور ادارے اور بھی ہوتے ہیں اُسے چاہیے کہ کہیں اور داخلہ لے لے شاید یہ اُس کے حق میں مفید ہو۔

صبر اور دوام

حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے اس واقعے سے ہم یہ بھی سبق سیکھتے ہیں کہ طالب علم کو حصول علم کے دوران جو مشکلات پیش آئیں اسے ان پر صبر کرنا چاہیے اور عجلت اور بے صبری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ یہ یہ بھی کہ طالب علم کو چاہیے کہ وہ مشکلات کے باوجود اسباق کا دورانیہ پورا کرے اور گھبرا کر درمیان ہی سے سلسلہ تعلیم چھوڑ نہ دے۔ استاد کے ساتھ لمبی مصاحبت طالب علم کے لیے ہمیشہ مفید ہوتی ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ نے اپنے استاد حماد کے سامنے اٹھارہ سال تک زانوئے تلمذ تہہ کیے رکھا اور جب تک وہ زندہ رہے ادباً اور مزید سیکھنے کے لیے کبھی مسند تدریس پر نہیں بیٹھے۔[1] مسلم تاریخ کا وہ دور جسے ہم علمی طور پر سنہری دور کہتے ہیں اس کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں طالب علم اپنے استاد کے ساتھ طویل عرصہ تک رہتا تھا یہاں تک کہ وہ استاد کا سارا علم حاصل کر لیتا اور استاد کی فکر اور عمل کا رنگ اس پر خوب چڑھ جاتا اور وہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک محترم استاد اور محقق کا درجہ حاصل کر لیتا۔

آج کل کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جہاں سمسٹر سسٹم رائج ہے وہاں طلبہ کو استاد کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملتا۔ تین چار مہینے کا سمسٹر ہوتا ہے اور اس دوران جب طالب علم کو کسی موضوع کی سمجھ

---

[1] ۔ بستوی، عبد الحلیم قاسمی، احسن الہدایہ، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، 36:1

آنے لگتی ہے تو سمسٹر ختم ہو جاتا ہے اور نئے سمسٹر میں نیا موضوع شروع ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طالب علموں کا علم سطحی رہتا ہے اور اس میں گہرائی پیدا نہیں ہوتی۔

ایران کے علمی شہر قُم میں نظامِ تعلیم یہ ہے کہ وہاں طالب علم بعض اوقات بیس سال سے زیادہ زیر تعلم رہتا ہے۔ تعلیمی ادارہ میرٹ پر مستحق طلبہ کے تعلیم کے علاوہ رہائش، خوراک، شادی وغیرہ سارے اخراجات برداشت کرتا ہے تا آنکہ طالب علم اپنے تخصص کا ماہر اور رسوخ فی العلم رکھنے والا عالم بن کر نکلتا ہے۔ اور اس کا وجود معاشرے کے لیے علم وحکمت اور خیر کا نمونہ ثابت ہوتا ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ سارا نظام پرائیویٹ سیکٹر میں ہے اور حکومت کے زیر انتظام نہیں۔

خلاصہ یہ کہ طالب علم کو چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح صبر کرے اور بے صبری کے مظاہرے سے بچے اور جس علم کے حصول کا اس نے قصد کیا ہے، اس وقت تک اپنے محاذ سے دستبردار نہ ہو جب تک وہ اسے حاصل نہ کرلے۔ اسی مصابرت اور دوام سے علم کے حصول کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔

خلاصۃ البحث

پوری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے علمی خزانے بڑے وسیع ہیں اور بندوں کو علم کا بہت تھوڑا سا حصہ دیا گیا ہے۔ کسی بھی بندے کو اپنے علمی مرتبہ پر فخر وغرور کی کوئی گنجائش نہیں۔ علم کی کوئی انتہاء نہیں، زندگی کے آخری دم تک حصولِ علم کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ حصولِ علم کے راستے میں جو بھی رکاوٹیں اور تکالیف آتی جائیں، ہمت اور مستقل مزاجی سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اپنے استاد کی عزت واحترام کا حد درجہ خیال رکھنا چاہیے اور اپنی کامیابی کا راز استاد کی خدمت میں مضمر تصور کرنا چاہیے۔ استاد یا علمی ادارے کی طرف سے جو بھی اصول وضوابط طے کیے جائیں اُن پر مِن وعَن عمل کرنا کسی بھی طالب علم کا اخلاقی فریضہ ہے۔

اسی طرح استاد کی بھی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ طالب علم کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رکھے۔ اُس کے قیمتی وقت کا ایک ایک سیکنڈ ضائع ہونے سے بچائے۔ پوری حکمت اور دانشمندی سے اُس کے علمی واخلاقی نشو نما کے لیے کوشاں رہے۔ اگر طالب علم سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اسے نرمی سے سمجھا دینا چاہیے اگر نہ سمجھے تو ذرا سختی سے پیش آنا چاہیے لیکن بالفرض اگر کوئی طالب علم بار بار غلطی کرے اور سزا وتنبیہ سے اصلاح نہ ہو سکے تو اسے علیحدہ کرنا چاہیے تاکہ ادارہ یا دوسرے طلباء اُس کے مضر اثرات سے محفوظ رہیں۔